ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

ایسوسی ایٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ڈویژن آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، لوئر مال کیمپس، لاہور ۔

ڈاکٹر شیر علی

صدر شعبہ اُردو الحمد اِسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

سارااماگو ایک ساحر اور صاحبِ بصیرت ناول نگار

(سارااماگو کے دوناولوں کا تنقیدی جائزہ)

Dr Nabeel Ahmed Nabeel
Associate Professor, University of Education, Division of Arts and Social Sciences, Lower Mall Campus, Lahore.
Dr. Sher Ali
Head of Urdu Department, Alhamd Islamic University, Islamabad.

Saramago, a Mesmerizer and a Visionary: Critical Analysis of Blindness and A Death with Interruptions

Jose Saramago is a seminal name in the annals of literature of the late twentieth and early twenty- first century. Studded with Nobel prize for literature in 2010, Saramago has managed to carve a unique place in our postmodern fiction. In the present article, two of Saramago's greatest novels ' Blindness ' and ' Death with Interruptions ' have been discussed. Blindness can be taken as a dystopian vision of our impending future when Man would cease to be cognizant about any values and as such his life would be a blind trudge. This is the very point that our writer wants to make; if we stop to see and understand our predicaments, time will not be far when we will cease to be humans at all. In Blindness, characters are blind to their own lack of understanding and perspective and it grows to such an extent that the blindness becomes a society wide scourge. Saramago's vision oozes out of the pages of the novel and seems to make a dialogue with the reader which in any case is the ultimate that a writer can ask for. In ' Death with Interruptions ‘, Saramago in this novel has taken up the perennial issue of life and death. What if death ceases to be? Behind the veil of discussion of necessity for death to be part of our lives,

Saramago has evaluated principal questions with regard to philosophy, religion, human psychology and sociology. The author has come a full circle; the question of death permeates the beginning as well as the end of the novel. In this article, effort has been made to introduce such a brilliant author and his work to Urdu centric readers and at the same time try to find some aspects of Saramago fiction which this scribe feels our Urdu reader is very much entitled to.

Key Words: *Philosophy, Religion, Sociology, Brilliant, Urdu, Saramago, Fiction, Blindness.*

خوزے سارا ما گو ۱۶/ نومبر ۱۹۲۲ء کو پر تگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے اور پر تگال میں ہی ۱۸/ جون ۲۰۱۰ء کو اُن کی وفات ہوئی۔ پر تگال کے "گارشیا مار کیز" کہلانے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب اور معروف ناول نگار "خوزے سارا ما گو" کو گزشتہ صدی کے اواخر میں اپنے ناول "اندھے لوگ" کے باعث بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ پر تگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ابتداً فلاکت زدہ زندگی سے آغاز کرنے والے خوزے سارا ما گو کا پہلا ناول ۱۹۴۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ناولوں کے علاوہ اُنھوں نے ڈرامے، افسانے، تنقیدی مضامین، روز نامچے، سفر نامے اور اخباری کالم بھی تحریر کیے۔ ان کی اہم تخلیقات میں ناولوں کی شان دار "تثلیث" (ٹرائلوجی)، "سِیگ"، "بلائینڈنیس" اور "ڈیتھ وِد اِنٹرَپشنز" کے علاوہ "دی اِیَر آف دی ڈِیتھ آف رِکارڈو رِیز"، "بالتاسار اینڈ بلِیمنڈا"، "دی گے و"، "دی ہسٹری آف دی سیگ آف لزبن"، "دی سٹون رافٹ"، "دی ڈبل"، اور "آل دی نیمز اور" وغیرہ شامل ہیں۔ انھیں ۱۹۹۸ء میں اَدب کے "نوبل انعام" سے نوازا گیا، لیکن اس سے قبل اُنھیں ایک غیر معمولی فکشن رائیٹر کے طور پر شہرت و مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ تاہم اس اعزاز کی بدولت امریکی مبصرین سمیت دُنیا کے متعدد برِ اعظموں کے ادبی ناقدین اور تجزیہ نگاروں نے سارا ما گو کو ایک اہم ناول نگار کی حیثیت سے نہ صرف تسلیم کر لیا تھا بلکہ اُن کی فنی عظمت کو بھی سراہنے لگے تھے۔ "بلائنڈنیس" (اندھے لوگ) اور "ڈیتھ وِد انٹرپشنز" (اِلتوائے مرگ) ان کے کارہائے نمایاں ہیں جس کے باعث انھیں "نوبل انعام" کے علاوہ اَدب میں "امریکا انعام"، "اعزازی ڈاکٹر مانچسٹر یونیورسٹی" اور "نشان فنون و ادب" (فرانس) سے بھی نوازا گیا۔

۱۔"اندھے لوگ":

۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آنے والے ان کے زبردست اور انوکھے ناول "بلائینڈ نیس" کو "اپوکلپٹک اور پوسٹ اپوکلپٹک فکشن" کی مد میں اہم ناول قرار دیا گیا ہے۔ اپوکلپٹک ناولوں میں ایسی کہانیاں پیش کی جاتی ہیں جن کے کردار کسی تباہی و بربادی سے دوچار سرزمین پر اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہیں جب کہ پوسٹ اپوکلپٹک ناولوں میں تباہ و برباد شدہ علاقہ یا شہر اپنے کرداروں کی زندگی کے لیے خوف ناک چیلنج بن جاتا ہے۔ ناول "اندھے لوگ" کے کردار ان دونوں اقسام کی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس لیے اس ناول کا تاثر زیادہ مضبوط اور فضا اس سے کہیں زیادہ متاثر کن ہے۔ پرتگیزی زبان میں لکھے جانے والے اس ناول کا ترجمہ اُسی سال (۱۹۹۵ء) گیوانی پونتیرو نے انگریزی زبان میں "بلائنڈ نیس" کے نام سے کیا، جو نیویارک سے شائع ہوا۔ ۲۸۸ صفحات پر مشتمل اس ناول کو ایک علامتی ناول قرار دیا گیا ہے جس میں اندھے پن سے مراد نابیناپن یا بصارت سے محرومی اپنے طبّی معنوں میں ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت کو دیکھنے سے انکار کی علامت ہے۔ اس ضخیم، ثقیل اور خاصے پیچیدہ ناول کا اُردو ترجمہ معروف شاعر احمد مشتاق نے کیا ہے جن کے متعلق ممتاز اُردو ادیب انتظار حسین لکھتے ہیں :

> "حیرت انگیز طور پر احمد مشتاق اِس میں (ترجمے میں) بڑی حد تک کام یاب نظر آتے ہیں کہ ساراماگو کے اسلوبِ تحریر سے وفاداری بھی نبھائیں اور اس کے بیان کی فصاحت کو بھی برقرار رکھیں۔"[۱]

بلاشبہ احمد مشتاق نے "بلائنڈ نیس" کو "اندھے لوگ" میں ڈھال کر صحیح معنوں میں ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے۔ ۳۵۲ صفحات اور ۱۷-ابواب پر مشتمل اس ناول کو معروف اشاعتی ادارے "شہر زاد" نے کراچی سے شائع کیا۔ خوزے ساراماگو کو کمیونسٹ نظریات کا حامی ادیب بھی تصور کیا جاتا ہے اور ان کی تخلیقات میں مارکس ازم اور کیپٹل ازم کا پرتو بھی محسوس ہوتا ہے، لیکن اس بات میں قطعی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ ظالمانہ حد تک سماج کی بھیانک تصویر دکھانے والا حقیقت نگار ہے۔ یہاں تک کہ "اندھے لوگ" کو پڑھتے ہوئے اکثر مقامات پر ہمیں دنیا سے نفرت کا احساس ہونے لگتا ہے اور اپنے ہی جیسے انسانوں سے کراہت محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ناول کی بوجھل فضا ایک عجیب سی اکتاہٹ پیدا کرتی ہے اور قاری کا جی متلانے لگتا ہے۔ دراصل اس ناول کا یہ حصہ سماجی حقیقت نگاری کو علامتی پیرائے میں بیان کرنے کی عمدہ مثال ہے۔ ساراماگو کا تخیل قاری کو معاشرتی بے حسی و اخلاقی زوال اور پستی کو اتھاہ گہرائیوں میں اُتار کر دکھاتا ہے جو خود بہ خود بغاوت کا تقاضا کرتی نظر آتی ہیں اور محبوس معاشروں کے افراد

کو اپنا اندھا پن خود دور کرنا پڑتا ہے یہی خوزے سارا ما گو کے مافی الضمیر کی آواز ہے۔اِس ضمن میں ایک مثال ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

"وہ بستروں کے درمیانی راستے کے ساتھ ساتھ گزرتی ، آہستگی کے ساتھ وارڈ کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی ۔اُس کے ننگے پیر فرش کے بول و براز سے مس ہو رہے تھے لیکن اُسے معلوم تھا کہ آگے گیلریوں میں حال اس سے بھی بدتر ہو گا۔ وہ دونوں جانب نگاہ ڈالتی رہی یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں کوئی اندھا نظر بند جاگ تو نہیں رہا، اگرچہ چاہے ان میں چند شب بیدار ہوتے یا پورا وارڈ ہی، جب تک وہ شور پیدا نہ کرتی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، اگر وہ شور پیدا کرتی بھی، تو ہم جانتے ہیں کہ ہماری جسمانی ضرورتیں کتنی شدید ہو سکتی ہیں۔ اُن کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں، مختصر یہ کہ وہ دراصل یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند جاگ اُٹھے اور اُس کی غیر موجودگی کو بروقت محسوس کرتے ہوئے اُس سے پوچھے تم کہاں جارہی ہو، پہلا سوال جو غالباً تمام خاوند اپنی بیویوں سے اکثر پوچھتے ہیں، دوسرا یہ کہ تم کہاں تھیں،اندھی عورتوں میں سے ایک عورت اپنے بستر پر سیدھی بیٹھی تھی ، اُس کے کندے پلنگ کے سرھانے والے تختے پر ٹکے ہوئے تھے اور اُس کی خالی نظریں سامنے والی دیوار پر مرکوز تھیں ، لیکن وہ اُسے دیکھ نہ سکتی تھی ۔ڈاکٹر کی بیوی نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا، جیسے غیر یقینی کی حالت میں ہو کہ اُس غیر مرئی تار کو چھوئے کہ نہ چھوئے ، جو فضا میں ڈول رہا تھا، جیسے ہلکا سا لمس بھی، یقیناً کسی نازک سے ارتعاش کو محسوس کیا ہو گا، پھر اُس نے اپنا بازو گر جانے دیا، جیسے اب اُسے دل چسپی نہ رہی ہو، اپنے پڑوسی کے خراٹوں کی وجہ سے اُس کا سو نہ سکنا ہی اُس کے لیے کافی تھا۔ ڈاکٹر کی بیوی دروازے کے پاس پہنچ کر اور بھی جلدی جلدی چلنے لگی، ہال دے کی جانب بڑھنے سے پہلے اُس نے اس حصے کے دوسرے وارڈوں کی طرف لے جانے والی گیلری کے دونوں طرف دیکھا ، یہ گیلری اور آگے جا کر بیت الخلاؤں کی سمت اور آخر میں باورچی خانے اور طعام خانے تک لے جاتی تھی ۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ ، اندھے نظر بند لیٹے ہوئے تھے ، وہ جو

یہاں آنے پر بستر حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے یا اس لیے کہ ہلے کے وقت وہ پیچھے رہ گئے تھے، یا اُن میں مقابلہ کرنے اور لڑائی جیتنے کی طاقت نہ تھی۔"(۲)

ناول کی کہانی ایک عجیب و غریب اندھے پن کی وبا سے شروع ہوتی ہے جو حیرت انگیز طور پر ایک آدمی کو بیچ سڑک پہ ٹریفک سگنل کھلنے کا انتظار کرتے ہوئے آ دبوچتی ہے۔ یہ بیماری جسے سارا ما گو نے "کلنکی" کا نام دیا ہے، عام نابینگی کی تاریکی کے برعکس انسان کو ایک دودھیا سفیدی کی دبیز چادر میں لپیٹ دیتی ہے۔ پہلا اندھا آدمی جس ماہرِ چشم (ڈاکٹر) کے پاس علاج کے لیے جاتا ہے، اس کے کلینک سے اس وبا کا خوف ناک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو رفتہ رفتہ پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ سوائے ڈاکٹر کی بیوی کے۔ اندھوں کو تندرست لوگوں سے دور رکھنے کے لیے پاگل خانے کی عمارت میں قرنطینہ کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کی بیوی جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے، اپنے شوہر کے ہمراہ جانے کے لیے اندھے پن کا جھوٹ بولتی ہے اور پہلے پہل سات لوگ اس عمارت میں جاتے ہیں۔ یہی سات لوگ اس ناول کے اہم کردار ہیں۔ جو آغاز سے اختتام تک اندھے پن، قرنطینہ کے جان لیوا مصائب و مسائل اور پوسٹ اپوکلپٹک صورتِ حال کو جھیلتے ہیں۔ خوزے سارا ما گو ناول میں ایک آفاقی اور ہمہ گیر فضا پیدا کرنے کے لیے ان کرداروں کو کوئی نام نہیں دیتا بلکہ انھیں ان کے پیشوں، ظاہری حلیے یا عمر کے لحاظ سے متعارف کراتا ہے، جیسے سیاہ پیوند والا بوڑھا، کالے چشمے والی لڑکی، ڈاکٹر، ڈاکٹر کی بیوی، بھینگی آنکھ والا لڑکا، پہلا اندھا آدمی اور اس کی بیوی۔ ناول کے دوسرے حصے میں اندھے لوگوں میں ایک شدت پسند گروہ اپنی طاقت اور اسلحے کے بل پر غنڈہ گردی پر اتر آتا ہے اور پاگل خانے کی عمارت کے ایک وارڈ کو باقاعدہ اپنی عیاشی کا اڈا بنا کر دیگر لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اندھے ہونے کے باوجود ذخیرہ اندوزی اور عورتوں کا جنسی استحصال بھی کرتے ہیں۔

سید جعفر احمد اندھے لوگوں پر ہونے والے اس ظلم و جبر کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

"جبر کے سائے میں پروان چڑھنے والے معاشرے واماندگی کا شکار ہو کر پژمردہ اور بے حس بن جاتے ہیں۔ تب ان میں بے ترتیبی کی بساند جگہ بناتی چلی جاتی ہے۔ معتوبوں کے اس معاشرے میں کچھ لوگ طاقت ور بن جاتے ہیں، اسلحے یا جسمانی طاقت کی بنیاد پر ہوتے وہ بھی معتوب ہی ہیں مگر وہ دوسرے معتوبوں سے من پسند کام کرواتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا جسمانی استحصال بھی کرتے ہیں۔ ناول

"اندھے لوگ" کے بد معاش اندھے، دوسرے وارڈ کے اندھوں پر اسی طرح کی حکم رانی کر رہے تھے ۔ کیا درست ہے اور نادرست ؟ محبوس معاشرے اپنی الگ اخلاقیات بنا لیتے ہیں۔ یہاں بہر طور طاقت کا واحد ذریعہ حکم رانی قرار پاتی ہے۔
یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ظلم اور جبر کے زیرِ تسلط معاشروں کا مقدر یہی ہے کہ وہ انسانی شرف اور وقار سے محرومی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قبول کر لیں ؟ خوزے سارا ما گو ہر گز ایسا نہیں سمجھتا۔ اس نے خود بھی اپنے ملک کے فاشسٹ حکمرانوں کی غیر قانونی حکومت کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ جمہوریت پسندوں اور آزادی خواہوں کے ہمنوا رہا، اپنے ناول میں اس نے اندھوں کے قرنطینہ میں ہونے والی غیر انسانی حرکتوں کے خلاف ان ہی سے بغاوت کروائی اور قرنطینہ کی عمارت کو آگ لگاتے ہوئے دکھایا۔ ایسا کرتے اندھوں ہی سے بغاوت کروائی اور قرنطینہ کی عمارت کو آگ لگاتے ہوئے دکھایا۔ ایسا کرتے وقت وہ اس بدیہی حقیقت ہی کا اظہار کر رہا تھا کہ ذلت اور جبر کو انسان نے کبھی اپنا مقدر تسلیم نہیں کیا۔ انسان جلد یا بدیر اپنی آزادی کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔"(۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب انسان اپنی آزادی پر اصرار و استقرار کر لیتا ہے اور پھر اُس کے بعد فاشسٹ قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کی ٹھان لیتا ہے تو اُس کی آواز کو کوئی بھی دبا نہیں سکتا اور نہ اُسے آزادی سے محروم کر سکتا ہے۔ ناول "اندھے لوگ" میں بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے کہ آخر کار ڈاکٹر کی بیوی، جو خود بھی ان ظالموں کی جنسی ہوس کا شکار بنتی ہے، تیز دھار قینچی سے حملہ کر کے ڈاکو گروہ کے سرغنہ کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ ایک اور جنسی ہوس کا نشانہ بننے والی عورت کے ہاتھ ماچس لگ جاتی ہے، جس سے وہ اُن اندھے ڈاکوؤں کی وارڈ میں آگ لگا دیتی ہے۔ آگ بے قابو ہو کر ساری عمارت میں پھیل جاتی ہے اور وہاں موجود ساتوں کردار کسی نہ کسی طرح جان بچا کر عمارت سے باہر نکلنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کی بیوی کی سرکردگی میں ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے جب یہ قافلہ شہر کی سڑکوں پر پہنچتا ہے تو ان کے ہنستے بستے "یوٹوپیا" کی جگہ ایک "ڈِسٹوپیا" یعنی تباہ حال شہر کا بھیانک منظر ان کا منتظر ہوتا ہے۔ لاشوں کے تعفن، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور بدبودار فضا میں، زوردار بارش رحمت بن کر نازل ہوتی ہے اور بارش کا پانی ان سات اندھے لوگوں کی نجاست و

غلاظت کو دھو ڈالتا ہے، پھر وہ خود کو منظم کر کے لباس،خوراک اور اپنے گھروں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ مصائب و مسائل کے ایک جمِ غفیر سے نبرد آزما ہونے کے بعد بلاآخر ایک ایک کر کے ان کی بینائی لوٹنے لگتی ہے اوراندھے پن کی کہانی کسی اور دنیا کی کہانی بن جاتی ہے۔اس مقام پر ڈاکٹر اور اس کی بیوی کے مابین مکالمہ ناول کے مرکزی خیال اور مصنف کی منشا کا خلاصہ پیش کرتا ہے:

"ہم اندھے کیوں ہوئے تھے؟ میں نہیں جانتا شاید ایک دن ہمیں معلوم ہو جائے گا۔

کیا تم چاہتے ہو کہ جو میں سوچتی ہوں تمھیں بتاؤں؟

ہاں میں چاہتا ہوں۔

میرا نہیں خیال کہ ہم اندھے ہوئے تھے،میرا خیال ہے کہ ہم اندھے ہیں، اندھے، لیکن دیکھنے والے،اندھے لوگ جو دیکھ سکتے ہیں، لیکن نہیں دیکھتے۔"(۴)

یہ چند جملے ایک شان دار تخلیق کی تمام تر ضخامت اور طوالت کا احاطہ کرتے ہوئے ناول کی روح بن جاتے ہیں۔ دراصل خوزے سارا ماگو نے اس ناول کے ذریعے انسانی سماج کی نزاکت اور نفاست کی اہمیت کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ اپنے تخیل کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے وہ انسانی معاشرے کی اُس بنیادی شائستگی، معقولیت، اور ڈیسینسی کی کمی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ،جو اس کے خیال میں محض ایک گمان بن چکی ہے، عقلی اور اخلاقی اندھوں کا سماج ہمارے سامنے لاتا ہے جہاں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون چلتا ہے۔ سارا ماگو کا تخیل ہمیں دکھاتا ہے کہ اقدار، اخلاق، نظم و ضبط، قانون اور سماجی نزاکت کے نام پر جو کچھ بھی ہمارے انسانی سماج کے پاس بچا ہے، وہ بھی ایک وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اگر اس لرزتی ہوئی بنیادوں والے سماج پر کوئی بھی تباہی یا ناگہانی آفت نازل ہو جائے تو رہی سہی کسر بھی نکل جائے گی، خود غرضی اور ذلت کا سیلاب اُمنڈ آئے گا اور بچی کھچی انسانیت بھی دنیا سے ناپید ہو جائے گی۔ دراصل سارا ماگو نے اپنی زندگی کا تقریباً نصف حصہ پُرتگال کے فاشسٹ آمر "اولیویر سالازار" کے دور میں گزارا جو اِٹلی میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر کے دور سے کم نہ تھا۔ سارا ماگو نے اندھے لوگوں کے قرنطینہ کے لیے جو پاگل خانے کی عمارت دکھائی ہے، وہ بھی ہٹلر کے جبری استحصال کے کیمپوں سے مماثل ہے، جہاں حکم عدولی کی سزا گولی کی صورت میں ملتی تھی۔ سارا ماگو کے انتقال پر دی ایسوسی ایٹڈ پریس کی طرف سے شائع ہونے والی موت کی مطبوعہ خبر کے ساتھ جو نوٹ شائع کیا گیا۔ اُس میں اندھے لوگوں کے قرنطینہ کو نازیوں کے ساتھ ساتھ فلسطینیوں کی "رامالہ" والی صورتِ حال سے بھی مماثل قرار دیا گیا ہے، جسے "اندھے لوگ" میں پیش کر کے

سارا ماگو دنیا کے مہذب معاشروں کے سامنے بڑے بڑے سوال اُٹھاتا ہے۔ وہ اربابِ اختیار اور صاحبانِ اقتدار کے سامنے اُن مظلوموں کی بے بسی اور ظالموں کی سفاکی کا نقشہ کھینچ دیتا ہے جو اکثر اوقات یہ جانتے تک نہیں کہ اس ظلم کی وجہ کیا ہے؟ وہ معتوب کیوں ٹھہرائے گئے ہیں؟ اور اُن کا انجام کیا ہو گا؟۔۔۔سارا ماگو کی پیش بینی اور جادوئی حقیقت نگاری نے مذکورہ عناصر و عوامل اور صورتِ حال کو ناول میں پیش کر دیا ہے، جسے بعد میں مذمت کرنے والوں نے بھی نہ صرف تسلیم کیا بلکہ سراہا بھی ہے۔ اِس حوالے سے الیکس ہچلر کے بقول:

"An obituary by The Associated Press recounts the "storm of protest" Saramago touched off in 2002,"when, during a visit, he compared Ramallah, a Palestinian city blockaded at the time by the Israeli army, to the Nazi death camps at Auschwitz and Buchenwald. Holocaust survivors and intellectuals, including left-wing doves who were highly critical of the Israeli government's policy toward the Palestinians, condemned Saramago's statement as false and anti-Sematic""" (5)

(ایسوسی ایٹ پریس کی جانب سے دی جانے والی خبر مرگ اُس "احتجاج کے طوفان" کی یاد دلاتی ہے، جسے سارا ماگو نے دو ہزار دو میں چھیڑا تھا، جب ایک سیاحتی دورے کے دوران اس نے اس وقت اسرائیلی فوج کی جانب سے محبوس کیے گئے ایک فلسطینی شہر "رَملّہ" کا موازنہ "Auschwitz" اور "Buchenwald" کے نازی ڈیتھ کیمپوں (حراستی مراکز) سے کیا۔ ہولوکاسٹ سے بچ جانے والوں اور دانش وروں نے جن میں بائیں بازو کی فاختائیں بھی شامل تھیں۔ جو اسرائیلی حکومت کی فلسطینیوں پر روا رکھنے والی پالیسیوں کے سخت خلاف تھے، سارا ماگو کے اس بیان کو غلط اور اینٹی سی میٹک (غیر سامی) قرار دیا۔)

اس طرح محبوس معاشروں کی نفسیات کا علم بردار بن کر یہ ناول ایک فکر انگیز اور دل دہلا دینے والی تخلیق بن کر سامنے آتا ہے، ایک ایسی تخلیق جو بیک وقت انسانی وجود کی بقا، غیر یقینیت اور شخصی آزادی جیسے موضوعات کو بھی ملفوف انداز میں پیش کرتی ہے اور دودھیا روشنی والے اندھے پن کو سماجی زوال، اخلاقی گراوٹ اور ذہنی غلاظت کے استعارے کے طور پر استعمال کر کے انسان کو اپنا اندرونی وِژن استعمال کرنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ خوزے سارااما گو کے ناول کے کرداروں کے لیے "وائٹ اِیوَل" بن جانے والی بصری بیماری در حقیقت وہ "سوشل اِیوَل" ہے جو سوسائٹی کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ: آنکھیں روح کا آئینہ ہوتی ہیں۔ یہاں سامنے کی بینائی سے اُوپر اُٹھ کر انسانی بصیرت کو نہ صرف موضوع بنایا گیا ہے بلکہ حقیقت کے ادراک پر پوری کی پوری توانائی پر زور دیا گیا ہے مگر علامتی پیرائے میں اور ظاہر ہے کہ علامات وضع کرنے پر جو مصنف کو دسترس حاصل ہے۔ یہی تو اُس کا آرٹ ہے۔ اسی فن سے تو وہ اپنی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرتا ہے۔ یہ عمیق نظری ہی سارااما گو کو انسانیت کا علم بردار اور ایک بڑا ناول نگار بناتی ہے۔

جب آنکھیں حقیقت کو دیکھنے سے انکار کر دیں یا جانب داری اور جہالت کی عینک سے ہر چیز کو دیکھنے کی عادی ہو جائیں تو روحانی اور اخلاقی زوال انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ وہ انسانیت کے بلند مقام سے حیوانیت کی ایسی پستی میں جا گرتا ہے جہاں اُس سے کوئی بھی رذالت اور گھٹیا پن بعید نہیں۔

اپنے تمام تر فنی و تکنیکی انوکھے پن کے باوجود 'اندھے لوگ' کا بیانیہ کئی متنازع مسائل سے دوچار ہے۔ لسانی اعتبار سے اس ناول کا سب سے بڑا مسئلہ صَرف و نحو سے متعلق ہے۔ سارااما گو کی اکثر تحریروں خصوصاً ناولوں کے انگریزی تراجم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رموز واوقاف کا استعمال کم سے کم کرتے ہیں، لیکن جہاں کرتے ہیں، وہاں کی گئی غلطی کی صورت میں متن کے معنی اور بیانیے کے تسلسل میں تبدیلی کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مکالموں میں بے ربطی اور کرداروں کی تعداد میں بتدریج اضافے کے باعث ناول میں اکثر مقامات پر ایک ایسا خلط ملط سا ماحول یا امتزاجی نوعیت کے حامل حالات وواقعات اور فضا اُستوار ہو جاتی ہے، جہاں قاری کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کیا کہہ کر رہا ہے۔ گزشتہ سال "عالمی اَدب کے اُردو تراجم" کے عنوان سے بنائے گئے، ایک سوشل میڈیا پبلک گروپ میں ایک قاری نے ناول "اندھے لوگ" کے بارے میں اپنے اولین تاثرات اور تجزیہ پوسٹ کیا تھا۔ ایک عام قاری اور نئے تجزیہ کار کی حیثیت سے ان کی رائے بڑی دل چسپ ہے۔ ف۔م عباسی کے نام سے یہ تجزیہ کار لکھتے ہیں:

"جب میں نے یہ کتاب "اندھے لوگ" پڑھنا شروع کی تھی تو سچ بتاؤں میرے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا تھا اور اس بات کا احساس مجھے ناول کے بیچ میں آ کر ہوا کہ مصنف کہانی کے ساتھ قاری کو بھی اندھا کر دیتے ہیں، جس سے مجھے بڑی اُکتاہٹ ہوئی۔ اندھے لوگوں کی طرح مجھے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اندھے پن کی وبا کیوں پھیل رہی ہے؟"

لیکن کسی نہ کسی طرح پورا ناول پڑھ لینے کے بعد ان کی رائے کچھ یوں تھی:

"ناول میں اندھے پن کو انسانوں میں موجود برائیوں پر روشنی ڈالنے کے لیے بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ طاقت کے دم پر لوگوں کو اپنا غلام بنانا، ذخیرہ اندوزی کرنا پھر اس کے بدلے میں ضرورت مندوں سے اپنے ناجائز مطالبات منوانا، عورت کو جنسی تسکین کا سامان سمجھنا، بدلہ، قتل، چوری، لالچ، اَنا، بے حسی، بے اعتمادی، ہٹ دھرمی، خود غرضی جیسی ہر برائی کو اپنی بقا کے لیے صحیح سمجھنا۔ بقول شاعر فقیر سائیںؔ:

؎ اپنے اپنے مفاد میں کوشاں　　گر نہ ہوں تو یہاں بقا نہیں ہے

یہ ایک مختصر تعارف ہے۔ ناول اپنے اندر اس سے کئی زیادہ تلخ حقیقتیں سموئے ہوئے ہے، جسے چند اقتباسات میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ خوزے سارا ما گو نے جس انداز میں انسان کو انسان کے روبرو کیا ہے۔ اُس کی مثال نہیں ملتی۔ مذکورہ ناول ۱۷- ابواب پر مشتمل ہے، لیکن اپنے اختتام پر آپ کی ساری زندگی پر پھیل جائے گا۔" (۲)

ادبی و تنقیدی نظریات کی پیچیدگیوں، بین السطور متنی مفاہیم اور کسی عمیق فلسفے کے بغیر ایک عام قاری کے سیدھے سادے مطالعاتی تجزیے کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ کتابوں اور ان کے تخلیق کاروں کا اپنا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر خاص و عام قاری کے ادبی مذاق اور مزاج سے ان کا منفرد انداز لگّا کھائے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ایک زبان زدِ عام ہو جانے والی کتاب ہر شخص پر اس کے مصنف کی منشا ظاہر کر دے۔ خوزے سارا ما گو کے تخیل کی پرواز بھی کچھ ایسی ہی ہے جس کی بلندی کو ماپنے کے لیے آسمانی علامات میں سے زمینی حقائق چننے ہوں گے۔ فرانز کافکا اور گابرئیل گارشیا مارکیز کی طرح تخیلاتی بستیوں اور تصوراتی دنیا کا سفر کرنے کے لیے ان کا ہاتھ تھام کر ہم سفر بننا ہوگا تا کہ زندگی کو جیسے اور جہاں سے وہ دیکھتے ہیں، ہم بھی دیکھنے کی سعی

کریں۔ عصری تقاضوں اور نئی فکری و عملی جہات کے آئینے میں ان تخلیقات کا عکس دیکھیں جو ہر دور کے انسان اور ہر زمانے کے سماج کی عکاس بن کر سامنے آتی ہیں۔

ناول "اندھے لوگ" پر "بلائینڈنیس" کے نام سے فلم بھی بنائی گئی جس کے بعد اس ناول پر اور زیادہ شدت سے ردِ عمل سامنے آیا۔ یہاں تک کے بی۔بی۔سی اُردو ڈاٹ کام پر، اس ناول کے متعلق ایک مضمون اس عنوان سے بھی لکھا گیا کہ "اس ناول کو نہ پڑھیں۔" اس تنقیدی مضمون میں نہ صرف لسانی مسائل اور متنی شواہد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے بلکہ اہم موضوعاتی اور نظریاتی نکات بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ مثلاً:

> "اس بات کا اندھے پن یا سارااما گو کے اس ناول سے کیا تعلق ہے، جس کا انگریزی نام "بلائینڈنیس" اور اُردو نام "اندھے لوگ" رکھا گیا ہے؟ ظاہر ہے۔ عام طور پر تصور یہ ہے کہ اندھے پن میں اندھیرے اور تاریکی کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا، لیکن ناول میں صورتِ حال یہ نہیں ہے۔" (۷)

پھر کرداروں اور بیانیے کے متعلق ایک اہم اور قابلِ غور نقطہ سامنے آتا ہے کہ جب حکومت اندھے پن کی اس اچھوتی بیماری کی روک تھام کے لیے اندھوں کو دماغی امراض کے مریضوں کے لیے مخصوص عمارت میں محصور کر دیتی ہے تو بھی اتنے اندھوں کے درمیان رہنے کے باوجود ڈاکٹر کی بیوی اندھی کیوں نہیں ہوئی؟ اور سارے شہر کے اجتماعی حالات کو محض سات کرداروں کی داخلی کیفیات سے بیان کرنا کیا انصاف ہو گا؟ انور سن رائے کے بقول:

> "سارااما گو نے اسے (ڈاکٹر کی بیوی کو) اندھا کیوں نہیں دکھایا؟ شاید اس لیے کہ اگر وہ اسے بھی اندھا دکھاتا تو پھر جو کچھ ہوا، اس کا داخلی بیان کرنے والا کون ہوتا۔ ناول میں یوں بھی تمام اندھوں کی حالت سات کرداروں کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔" (۸)

اور یہ کہ:

> "ہم اندھے کیوں ہوئے تھے؟ یہ بات ڈاکٹر کی بیوی نہیں کہہ سکتی، وہ اندھی نہیں ہوئی، وہ تو اس بات کو سنتے ہوئے کھڑکی کے پاس جاتی ہے، نیچے فضلے سے بھری سڑک اور چیختے چلاتے لوگوں کو دیکھتی ہے اور جب آسمان کی طرف سر اٹھاتی ہے تو اس کے

سامنے وہی سفیدی آ جاتی ہے، جو ایک وبا کی طرح لوگوں کو اندھا کرنے کے بعد ختم ہونا شروع ہوئی ہے۔" (۹)

بلاشبہ یہ فقرے فکر انگیز ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس صبر آزما ناول کو پڑھنے کے بعد دل و دماغ سے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہی سارا ما گو کی کامیابی کی دلیل ہے۔ وہ ناول کو عام ناول نگاروں کی طرح سیدھے سادے پلاٹ اور بیانیے کے ساتھ پیش نہیں کرتا اور نہ ہی مکالماتی انداز اختیار کرتا ہے بلکہ قاری کو خود پتا لگانا پڑتا ہے کہ اب کون کیا کہہ رہا ہے اور کون جواب دے رہا ہے۔ پھر سارا ما گو نے جس طرح اندھے لوگوں کی مشکلات کی منظر کشی کی ہے، وہ مناظر قاری پر سکتہ طاری کر دیتے ہیں۔ کئی مقامات پر قوتِ برداشت جواب دینے لگتی ہے، لیکن جوں جوں ان مراحل سے گزرتے جائیں تو ناول کی معنویت، پوشیدہ رموز اور علامات کھل کر سامنے آنے لگتی ہیں جو بلا مبالغہ انتہائی غیر معمولی ہیں۔ یہ ناول جبریت اور جکڑ بند کا شکار معاشروں پر قائم آمرانہ تحکم اور ان معاشروں کی داخلی نفسیات کو مجموعی طور پر بے نقاب کرتا ہے۔ خوف میں مبتلا سماج کے افراد ایسے اندھے لوگوں کی مانند ہی ہوتے ہیں جو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ تاہم سارا ما گو کا رویہ مایوسی کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ اپنے ساتوں کرداروں کے ذریعے بقا کی جنگ دکھاتا ہے اور ہمت نہ ہارنے کا درس دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو کم قصور وار ٹھہراتا ہے اور ان کے اندھے پن کو زیادہ۔ اسی لیے اصلاح بھی اندھے پن کی ہونی چاہیے جب اندھا پن دور ہو جائے گا تو اندھے لوگ خود بخود دیکھنے لگیں گے۔ یہی بات وہ ناول کے آخر میں "کالے چشمے والی لڑکی" کے منہ سے بھی کہلواتا ہے:

"ساری حالتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں کبھی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ایسی کوئی چیز نہیں جسے اندھا پن کہا جا سکے صرف اندھے لوگ ہوتے ہیں، لیکن وقت اور تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ یہاں اندھے لوگ نہیں ہیں، صرف اندھا پن ہے۔" (۱۰)

در حقیقت جبر، استحصال اور ظلم سے نجات کے لیے اِسی اندھے پن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ شان دار ناول "اندھے لوگ" سارا ما گو کی ایک زندہ رہنے والی تخلیق ہے جو ہر دور کے مجبور اور مظلوم اپنے کردار سے غافل معاشروں کو ان کے اندھے پن کا احساس دلاتی رہے گی۔

۲۔ "اِلتوائے مرگ":

خوزے ساراماگو کے سہ کتابی سلسلے (ٹرائیلوجی) کی آخری کڑی "ڈیتھ وِد اِنٹرپشنز" ہے جس کا اُردُو ترجمہ "اکادمی ادبیات اسلام آباد" کے دارالترجمہ سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کے عنوان کا لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے، اِسے "اِلتوائے مرگ" کا نام دیا گیا اور اس کا آغاز مرزا غالبؔ کے اس شعر سے کیا گیا ہے:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

اس ناول کے مترجم مبشّر احمد میر ہیں، جن کے متعلق اکادمی ادبیات کے نگرانِ اعلیٰ ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو کی رائے ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

> "مبشر احمد میر صاحب کا نام اگرچہ ادبی حلقوں میں زیادہ معروف نہیں، لیکن اس ترجمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف انھیں اُردُو اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہے بلکہ وہ فکشن کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس ناول کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ یہ ایک مشکل ناول ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خوزے ساراماگو کا اُسلوب بہت گنجلک ہے۔ علاوہ ازیں وہ سکتہ تکنیک سے کام لیتا ہے جو اسے مزید گنجلک بنا دیتی ہے۔ میر صاحب نے یہ ترجمہ کرتے ہوئے ناول نگار کی اس تکنیک کو اُردُو میں برقرار رکھا ہے اور اس میں پوری طرح کام یاب بھی ہوئے ہیں۔" (۱۱)

"التوائے مرگ" کی کہانی کو خوزے ساراماگو نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں ایک بے نام ملک میں موت کی ہڑتال کی خبر ملتی ہے، جہاں یکم جنوری سے ہر جگہ موت تعطّل کا شکار ہے۔ گویا وہ فرانز کافکا اور گابرئیل گارشیا مارکیز کی طرح ناول کے ابتدائی جملے سے ہی قاری کی توجہ کو جکڑ لیتا ہے:

> "اس سے اگلے روز، کوئی نہیں مرا، اس حقیقت نے، ان حالات میں، زندگی کے اُصولوں کے بالکل برعکس ہوتے ہوئے، لوگوں کے ذہنوں میں قابلِ جواز شدید ہیجان پیدا کیا، اس لیے کہ تاریخِ عالم کے چالیس ادوار کا مطالعہ کریں تو کہیں بہ طور مثال بھی ذکر نہیں ملے گا۔" (۱۲)

پہلے پہل عام لوگوں کا نہ مرنا ایک خوش خبری سمجھا جاتا ہے اور لوگ موت کو مفتوح اور زندگی کو فاتح ماننے لگتے ہیں کیوں کہ صرف لوگ تھے جو نہیں مر رہے تھے باقی تمام زندہ اشیا مر رہی تھیں۔ جانور، پرندے،

حشرات اور نباتات سب حیات و ممات کے دائرے میں معمول کے مطابق گردش کر رہے تھے، سوائے انسانوں کے۔ بعد ازاں یہ معاملہ ایک وبا اور ناگہانی آفت جیسے حالات سے دوچار ہو جاتا ہے۔ موت کا نہ آنا کئی کاروبار بھسم کر کے دیوالیہ نکال دیتا ہے۔ خصوصاً جنازے کی رسومات ادا کرنے والے، بیمہ اور انشورنس کمپنیاں بری طرح زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ سارا ماگو نے درج ذیل الفاظ میں اس کی کیا خوب منظر کشی کی ہے:

> "ہماری صنعت کو ایک بھیانک خطرہ لاحق ہے، بیمہ کمپنیوں کی فیڈریشن کے صدر نے میڈیا کو، ہزارہا خطوط کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا، جو کم و بیش مخصوص اصطلاحات میں نیزے تانے ہوئے، جیسے وہ ایک ہی مسودے سے نقل کیے گئے ہوں، گزشتہ چند دنوں سے، ہر دستخط کنندہ کا، بیمہ زندگی کی فوری منسوخی کا مطالبہ کرتے ہوئے، اُن کے دفاتر میں سیلاب کی طرح آ رہے تھے۔ جانی پہچانی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے کہ موت نے خود کو ختم کر لیا ہے۔" (۱۳)

ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارا ماگو نے ابدی زندگی کے نظریے کو گویا ایک وقتی کھیل یا آفتِ ناگہانی کی صورت میں پیش کیا ہے اور سارا ملک اس مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے ممکنہ حل پیش کر رہا ہے، کمیشن بنائے جاتے ہیں، کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں، سیاست، مذہب، فلسفہ سب ایک سوال کا جواب تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ "مرا کیسے جائے؟"

لیکن درحقیقت اس ناول کا اُسلوب اور پلاٹ بھی اُسی قدر معنی خیز اور علامتی ہے جتنا کہ خود ناول۔ مرکزی قصے کے مذکورہ حصّے میں سارا ماگو کا فن اور نظریہ دونوں ترفع پر نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی اور موت کی معنویت کو انتہائی دل کش اور معنی خیز انداز میں سامنے لاتے ہیں اور ان دو ناقابلِ تردید حقیقتوں کی راہ میں تعطل، التوا اور رکاوٹ کو لا کر نوعِ انسانی کے تمام مکاتیبِ فکر کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر دیتے ہیں۔ بقول سارا ماگو:

> "موت بہتر ہے، ایسے نصیب سے، کیتھولک ترجمان نے کہا، پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے، آپ کیا تجویز کرتے ہیں، قنوطیوں میں سب سے بوڑھے نے دریافت کیا، اس کمیشن کی فوری تحلیل سے، جو بہ ظاہر آپ چاہتے ہیں، ہٹ کر، ہمارا، پاپائے اعظم کا کیتھولک کلیسا، دعا کی قومی مہم شروع کرے گا، خداوند سے استدعا کرتے ہوئے کہ، بے بس انسانیت کو بدترین دہشت سے بچانے کی خاطر موت کو واپس لائے، کیا خداوند کو

موت پر اختیار حاصل ہے، رجائیوں میں سے ایک نے سوال کیا، وہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، ایک جانب بادشاہ اور دوسری جانب تاج، اس صورت ہی شاید خداوند تھا، جس نے موت سے دست بردار ہونے کا کہا، ایک دن ہم جان جائیں گے، اس نے ہمیں اِس آزمایش میں کیوں ڈالا، اس دوران میں ہم مقدس مریم کی تمجیدی تسبیح جاری رکھیں گے، ہم بھی یہی کریں گے، تاہم، تمجیدی گیتوں کے بغیر، پروٹسٹنٹ مسکرایا، اور ہم ملک بھر میں موت سے واپسی کی درخواست کرنے کی تقریبات کا انتظام کریں گے، اُسی طرح جیسے ہم بارش کے لیے دعائیہ تقریب میں بارش کی درخواست کرتے ہیں، کیتھولک نے ترجمہ کیا، ہم اس حد تک نہیں جاتے، ایسی رسمیں ہماری روایت میں شامل نہیں، پروٹسٹنٹ ایک مرتبہ پھر مسکراتے ہوئے بولا، اور ہم کیا، ایک رجائی نے اس لہجے میں جو اس کے قریب الوقوع حزبِ اختلاف میں شامل ہونے کا اعلان کرتا محسوس ہوتا تھا، سوال کیا، اب، جب لگتا ہے کہ ہم پر سب دروازے بند ہوگئے ہیں، ہم کیا کرنے جارہے ہیں، آغاز کرتے ہوئے، بوڑھے فلاسفر نے جواب دیا، ہمیں یہ اجلاس برخاست کرنا چاہیے، پھر کیا ہم غور و فکر کرتے رہیں گے، کیوں کہ یہی کام ہے جسے کرنے کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں، بھلے ہمارا تمام غور و خوض بے سود ہو، کس لیے، میں نہیں جانتا کس لیے، ٹھیک ہے، پھر کیوں؟ کیوں کہ فلسفہ کو بھی موت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مذہب کو، اگر ہم سوچتے ہیں کہ یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم مریں گے تو، جیسا کہ موسیو مونٹینیو کا کہنا ہے، تو سوچنا یہ جاننا ہے کہ کیسے مرا جائے۔" (۱۴)

بلاشبہ یہ خوزے سارااما گو جیسے بڑے تخلیق کار ہی کا کام ہے کہ دنیا بھر کی ریاضت، سیاست، فلسفے اور مذہبی افکار و نظریات کے بحر بے کراں کو کمال مہارت سے کوزے میں بند کردیا ہے۔ ایک طرف ان کا اپنے ناولوں میں عجیب و غریب، اچانک و قوع پذیر ہونے والی ناگہانی اور بحرانی کیفیت کو جنم دینا اور پھر اُسے منطقی انجام کی طرف دل چسپ پیرائے میں موڑنا۔۔"التوائے مرگ" میں بھی جب یہ بحران ملکی و قومی سلامتی کے معاملات کے لیے ایک چیلنج کی سی حیران کن صورتِ حال اختیار کرلیتا ہے تو سارااما گو کہانی میں موت کی انٹری (واپسی) سے ناول کا

دوسرا حصہ ترتیب دیتے ہیں۔اب "موت" بہ حیثیت ایک نسوانی کردار ہمیں مجسم نظر آتی ہے اور ایک بنفشی ،دستخط شدہ خط بھیج کر وہ باقاعدہ اپنے آنے کی اطلاع دیتی ہے کہ "محترم عالی وقار، میں آپ کو اور ان سب کو جن کا اس سے تعلق ہے مطلع کرنا چاہتی ہوں کہ آج نصف شب سے لوگ پھر سے مرنا شروع کر دیں گے۔" ملک کے صدر کی موت سے یہ سلسلہ بحال ہو جاتا ہے، لیکن اب موت اپنی آمد کی اطلاع دے کر آرہی تھی۔وہ بنفشی خط بانٹ رہی تھی، ایک مکمل عورت کے روپ میں، پہلے پہل ایک استخوانی ڈھانچے والی کفن پوش عورت اور بعد میں ایک گہرے رنگ کے چشمے والی جدید تراش خراش کا لباس زیبِ تن کیے، ناز و انداز سے سجی حسین ترین عورت۔۔۔جو اپنا ایک خط دو بار لوٹائے جانے کے بعد ایک پچاس سالہ "سیلو نواز" کو بہ ذاتِ خود خط پہنچانے کے مشن پر روانہ ہوتی ہے مگر اس بار موت ناکام رہتی ہے اور آخر کار بنفشی خط کو خود اپنے ہاتھوں سے جلا کر سیلو نواز کے بستر میں دراز ہو کر اطمینان سے سو جاتی ہے اور پھر:"اس سے اگلے روز کوئی نہیں مرا۔"

ناول کا یہ آخری جملہ ہی ناول کا پہلا جملہ ہے۔زندگی اور موت کی گردش کے فلسفے اور نظریے کو ناول میں بیان کرنے کا ایسا خوب صورت اور انوکھا اُسلوب لائق تحسین اور ناقابلِ فراموش ہے۔بالخصوص موت جیسی کریہہ،ڈراؤنی اور قابلِ نفرت سمجھی جانے والی حقیقت کو اِس قدر تفصیلی انداز میں برتنا کہ اس کی واحد، جمع، تذکیر و تانیث، معرفہ، نکرہ سے لے کر اس سے جڑی کہاوتیں، داستانیں اور تصورات و نظریات تک ایک ۱۷۶ صفحات کے مختصر ناول میں سمیٹ دیے جائیں اور بات وہیں لا کر ختم کر دی جائے، جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ناول کے پلاٹ، جملوں کی ساخت اور دیگر ہیئتی تکنیکوں کو معنوی انداز میں برتنا سارا ماگو کا لاثانی فن بھی ہے اور تخلیقی ہنر بھی۔ایسی کرافٹ اور فن کا مظاہرہ کم ناول نگاروں کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔سارا ماگو کے ہاں ویسے بھی تجزیاتی انداز نہیں پایا جاتا۔وہ فلسفے اور حقیقت کا ایک ایسا آمیزہ تیار کرتے ہیں، جس میں ایک اَن دیکھی فضا کا تاثر مسلسل چھایا رہتا ہے، لیکن ان کی ظاہری کہانیوں کے پس پردہ کئی پوشیدہ سماجی، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور تاریخی حقائق سمائے گئے ہیں۔وہ نتائج اور تاثرات کو قاری کی صواب دید پر چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم نے آغاز سے انجام کی طرف سفر کیا تھا یا درحقیقت۔۔۔اختتام سے ہی آغاز ہوا تھا۔ایسا منفرد اسلوب اور ملفوف انداز میں سنگین حقائق کا انوکھا بیانیہ ادبی حلقوں اور قارئین کو اکثر ایک جھٹکا بھی دیتا ہے اور ادبی، سماجی اور سیاسی نظریات کو پیش کرنے کے لیے روایتی سلسلے سے ہٹ کر ایک نئی راہ دکھاتا ہے۔لہٰذا اِن فنی و تخلیقی اوصاف کی بنا پر خوزے سارا ماگو کو مغرب کے ادبی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی بھی ملی اور تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔یورپ کے ادبی، سیاسی اور تنقیدی حلقوں میں سارا ماگو اور اس کے

ناولوں کو بڑے وسیع پیمانے پر فلسفے اور سیاست کے آمیزے کے طور پر دیکھا گیا۔ناقدین نے اُسے اَن مٹ نقوش چھوڑ جانے والا سیاسی ناول نگار قرار دیا جس کے ادبی نظریات اور نثری اُسلوب میں یورپی تہذیب، کلچر اور سماج کے تلخ حقائق ملفوف انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ساراماگو کی وفات پر معروف رسائل و جرائد میں ،اظہارِ افسوس کے ساتھ ساتھ ''اندھے لوگ'' اور ''التوائے مرگ'' جیسے شاہکار ناولوں کے بارے میں جو توصیفی و تنقیدی کلمات کہے گئے اور آرٹیکلز لکھے گئے۔وہ ان ناولوں کے سیاق و تناظر کی کئی اور گرہیں اور پرتیں بھی کھولتے ہیں۔مثلاً:ساراماگو کی وفات پر ''دی اٹلانٹک'' میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل کے مطابق:

> "He was Indelibly Political...Benjamin Kunkel at n+1 mourns the death "not only of arguably the greatest novelist of last these quarter century, but of a great political novelist" as well.Kunkal notes that "most critics didn`t know how to square Saramago`s Marxism with his fiction. His politics,however,suffuse most of his novels...As for the premise of "Death With Interruptions,from2005 ,according to which the people of a nameless country simply stop dying as of one New Year`s Eve, this was not a mere magic –realist conceit but the framework for a meditation on the gray capitalism of aging European societies."(15)

مارکس ازم، کیپٹل اِزم اور دیگر مغربی اِزم کے ساتھ ساتھ ناقدین نے ساراماگو کے ناولوں میں یورپی سماج پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے سیاسی حقائق کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔انیسویں صدی کے اواخر تک جدیدیت کے رنگ ادب پر گہرے اور عمیق ہو چکے تھے اور اس کے کئی شیڈ بکھر چکے تھے، ساراماگو نے ان شیڈز کو عصری مسائل سے ہم آہنگ کر کے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔تاہم جو سب سے مضبوط، گہرا اور پختہ رنگ مجموعی نظریہ کے طور پر ساراماگو کے فن میں ملتا ہے۔وہ انسانیت،احترامِ آدمیت، فرد کی آزادی اور حقائق کا ادراک ہے اور

بہرِ حال یہی دنیا کا سب سے بڑا "اِزم" اور سب سے خاص نظریہ ہونے کا حق دار ہے۔ خوزے ساراما گو نے اس حق کو ادا کرنے کی سعی میں اپنے اسلوب اور نظریات میں جدید آفاقی موضوعات کا آمیزہ شامل کر کے ناول نگاری کی عمارت کو نیا ڈھانچہ اور سانچہ عطا کیا ہے۔ ناول نگاری میں جدیدیت کے رجحانات اور متنوع جہات کو سمونے کا انداز مغرب ہی کا خاصا ہے اور مشرقی ممالک کی نسبت یورپی تخلیق کاروں کے ہاں جس قدر منفرد انداز میں اسے برتا گیا ہے، اُسے عالمی ادیبوں اور ناقدین نے سراہا بھی ہے۔ قائد اعظم لائبریری کے اَدبی مجلے "مخزن" میں شامل ایک مضمون میں رشید جالندھری لکھتے ہیں:

> "مغرب کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کو بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ کم از کم نشاۃِ ثانیہ کے بعد سے تو وہاں یہی دستور رہا ہے کہ نئی دریافتیں ہوں، نئے افکار، نئے اسالیبِ شعر، نئے لائحہ حیات کو ممکن حد تک فروغ دیا جائے۔ لہٰذا وہاں اَدبی جدیدیت کو رُجعت پرستی، سامراجی سازش، اخلاق سوز، عوامی مسائل سے بیگانہ نہیں کہا گیا۔ ہم لوگوں کو ایسے ہی الزامات سننے پڑے۔"(۱۶)

اُردو ناول، نئے تجربات کی شمولیت یورپی ناولوں کے تراجم کے زیرِ اثر بیک وقت تعریف و توصیف اور طنز و تشنیع کا شکار رہا ہے۔ جدید دور کے سائنسی موضوعات، ثقافتی نظریات اور فلسفیانہ نظریات کے تغیر نے ناول نگاری کے فن کو جس تبدیلی سے دوچار کیا ہے، وہ محض فطرت نگاری یا کردار نگاری کے برعکس ایک نئے ہمہ گیر اور آزادانہ نقطۂ نظر سے بھرپور ناولوں کی تخلیق کا سبب بنے گی۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اپنی کتاب "ناول کیا ہے؟" میں لکھتے ہیں:

> "آج کل انسانی زندگی کے نظریات ہر جگہ متزلزل اور تغیر پذیر ہیں۔ اخلاقیات، مذہبیات، سیاسیات اور معاشیات میں اہم تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور عام شخص کی زندگی نہایت بے توازن ہو کر رہ گئی ہے، زیادہ تر لوگوں کو کسی چیز پر عقیدہ نہیں ہے، جس کا لازمی نتیجہ اَدب پر عموماً اور ناول پر خصوصاً پڑ رہا ہے، ناول کے موضوعات، ہیئت اور روحانی اثر میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں مگر اب تک کوئی خاص راہ نہیں نکل سکی ہے، ناول نگار اپنی طبیعت کو فنی اعتبار سے کسی خاص نظام اور اصول متبدہ پر نہیں لا سکا ہے، اسی لیے ناول کا کوئی اثر نہیں باقی رہا ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود جو بھی یہ اُمید کی

جاتی ہے کہ نظریات اور عقائد کا توازن پختہ ہو کر اعلیٰ ناول نگاری کی داغ بیل ڈال دے گا۔

پھر کچھ نئی سائنس کی معلومات نے ناول نگاروں کے ذہنوں پر ایسا قابو پالیا ہے کہ وہ ان معلومات کی روشنی میں فن ہی کو ایک مختلف اور نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ فرائڈ کے نظریاتِ نفسیات اور مارکس کے اقتصادی اور سیاسی عقائد نے انسانی فطرت کے بھی مفاہیم میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور ناول نگار اپنے کرداروں میں بجائے انسانوں کے بنے ہوئے میکانکی ہیولے پیش کرتا ہے، اس سے لازمی طور پر فطرت نگاری بالکل ختم ہو رہی ہے اور اس لیے ناول ایک زمانے میں بالکل مقالہ یا رسالہ ہو کر رہ جائے گا، مگر دوسری طرف یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح مذہبی وِجدان ناول کے ابتدائی مستقبل میں ایک نئی اور آزادانہ نقطۂ خیال کی روح پھونک دی تھی، اسی طرح کیا عجب ہے کہ یہ نئے نظریات مستقبل میں ناول کو زیادہ ہمہ گیر بنا دیں، جہاں ہم انسانی اعمال اور کردار کی گوناگوں حالت کا مطالعہ کر سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ ناول کے موضوعات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ہر قسم کے تجربات کی کھپت ہے، پھر فن کاری میں بھی مختلف تجربات کیے گئے ہیں مگر ان سب چیزوں میں ابھی زور نہیں پیدا ہوا ہے، لیکن اُمید کی جا سکتی ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد یہ لازمی زور پیدا ہو جائے گا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا مستقبل فنی عمدگی کے لحاظ سے بھی ہمت افزا ہے۔"(۱۷)

ناقدین نے سارااما گو کے ناولوں میں پائی جانے والی جدت، آفاقیت اور ہمہ گیر نظریے کی بنا پر اسے "نوبیل انعام" کا حق دار قرار دیا۔ بلاشبہ خوزے سارااما گو جیسے تخلیق کار نہ صرف یورپی اَدب کی شان ہیں بلکہ عالمی اَدب میں ناول کی ایک نئی پہچان ہیں۔ ایسے ناولوں کے اُردو تراجم اور تجزیے اُردو ناول کو کئی نئے زاویوں سے روشناس کرانے میں مددگار ثابت ہوں گے کیوں کہ سارااما گو کی کتابیں صرف پڑھنے، حظ اُٹھانے یا وقت گزاری کے لیے مزے لے کر پڑھنے والی کتابیں ہر گز نہیں ہیں۔ یہ علامتی تخلیقات ایسے عصری شعور، فہم و بصیرت اور ذہنی پختگی اور بالیدگی کی متقاضی ہیں جو انھیں بار بار پڑھ کر جذب کرنے کے قابل ہو۔ عصری اور سماجی حقائق کے تناظر میں جب

ان فن پاروں کو پرکھا جائے تو قاری کے سامنے دنیا کے پوشیدہ راز اور کائنات کے مخفی اسرار کھل کر واضح ہو جائیں۔ ''بیکن'' ایسی کتابوں کو کام یابی کی ضمانت قرار دیتے ہوئے اپنے مقالے ''Of Studies'' میں لکھتا ہے:

> ''کچھ کتابیں چکھنے کے لیے ہوتی ہیں، کچھ نگل جانے کے لیے اور کچھ کتابیں مزے لے لے کے پڑھنے اور جذب کر لینے کے لیے ہوتی ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر کچھ کتابیں صرف سرسری طور پر اِدھر اُدھر کے پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں اور کچھ کو مجبوراً پڑھنا پڑتا ہے اور کچھ کا پوری توجہ اور دل چسپی سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کو کتبوں پر لکھ کر اس کے اقتباسات ضرورت کے لحاظ سے دیکھ لیتے ہیں۔ ایسا معمولی کتبوں موضوعات اور کم اہم کتب کے سلسلے میں ہوتا ہے، جن کا ایسنز نکال لیا جاتا ہے ۔ مطالعہ انسان کو مکمل کرتا ہے، بہ حیثیت مباحثہ انسان کو تیار کرتا ہے اور لکھنا انسان میں مہارت پیدا کرتا ہے۔''(۱۸)

بلاشبہ خوزے ساراما گو کی تصنیفات ایسی ہی عمدہ ہیں اور وہ ایک بڑے رائٹر ہیں۔ پرتگال میں Antonio de Oliveira Salazar کی طویل عرصے تک آمریت کا دور دورا رہا، اُس نے پرتگال میں اپنی سیاسی پارٹی نیشنل یونین (National Union) کی بنیاد ۱۹۳۰ء میں رکھی تھی۔ سالازار کی Lisbon میں ۲۷/ جولائی ۱۹۷۰ء میں موت واقع ہوئی تھی۔ پرتگال میں سالازار نے ۱۹۳۳ء میں اقتدار پر قبضہ جمایا تھا اور پھر مذکورہ آمریت کا سلسلہ ۱۹۷۰ء کے بعد سالازار کی موت کے بعد تک بھی چار سال برابر جاری رہا تھا۔ سالازار امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں سیاسی و اقتصادی اُمور کا پروفیسر بھی رہ چکا تھا اور وہ کیپیٹل ازم کا بہت بڑا حامی تھا۔ ساراما گو نے سالازار کے عہد میں انسانیت کے لیے بہت کچھ حوالۂ قلم کیا اور اُس کے بعد بھی متعدد کتابیں حوالۂ قلم کیں۔ اُن کے ناول ''اندھے لوگ'' کا ایک حوالہ مذکورہ دور کی آمریت کی بھی جلوہ گری کرتا ہے۔ 'ملیز' کی جڑیں بہت گہری ہیں، ملیز کا مسئلہ زیادہ Deep Rooted ہے۔ ساراما گو اپنے کو فقط سیاسی صورتِ حال تک محدود نہیں رکھتا کیوں کہ سیاسی صورتِ حال تو چند لوگوں تک محدود ہوتی ہے۔ ساراما گو دِکھاتا ہے کہ ساری سوسائٹی ہی Corrupted ہے، جس میں فرد ذاتی سطح پر بلکہ ہر ایک سطح پر مادّیت اور طاقت کے حصول کے لیے سب کچھ کرنے کو تیّار ہے اور بے ایمانی بڑے پیمانے پر افراد کی سوچ کا مرکز و محور بن چکی ہے۔ ساری سوسائٹی ہی خراب ہے، اور حقیقت سے فرار ہی 'بلائنڈنیس' ہے اور حقیقت کا ادراک نہ کرنے کی جو صورتِ حال ہے اور حقیقت سے ناشناسی کا جو رویہ ہے اور پھر یہ کہ حقیقت کو

جاننے کی جو صلاحیت ہے کہ حقیقت کو دیکھا جائے اور حقیقت کو تسلیم کیا جائے، اور پھر اُس کے نتیجے میں اپنی اصلاح کی جائے۔ مذکورہ صلاحیت کو پوری کی پوری سوسائٹی ہی کھو چکی ہے۔ سارااما گو یہ کہتا ہے کہ ہمارے اندر جو حقیقت ناشناسی کا رویہ یا سوچ ہے، اِس کو ختم کیا جائے۔ یہ جو حقیقت ناشناسی کی صورتِ حال ہے، وہ پورے کے پورے معاشرے میں سرایت کر گئی ہے، یہ فکری انحطاط چند لوگوں تک محدود نہیں ہے، حقیقت کو نہ جاننے کی سوچ یا رویہ پورے معاشرے میں ہے اور ملیزی کی جو بیماری یا مسئلہ ہے، وہ پوری سوسائٹی کی سطح پر ہے۔ وہ کسی ایک سیاسی سطح تک محدود نہیں ہے، سیاسی سطح اُس کا ایک پرتو ہے اور یہ ساری صورتِ حال آمریت ہی کا نتیجہ ہے۔ آمریت جو کچھ کرتی ہے، اُسی کا معاشرے سامنا کرتے ہیں۔ آمریت کے نتیجے میں پوری سوسائٹی ہی بدعنوان ہو جاتی ہے۔ یہی سالازار کے دورِ آمریت میں ہوا تھا۔ پرتگال میں آمریت کے جو مضمرات رہے، اُن کا اطلاق کسی بھی ملک کے نظام پر کیا جا سکتا ہے۔ پرتگال میں بھی پوری سوسائٹی سوچنا سمجھنا بھول گئی تھی۔ یہاں تک کہ پوری سوسائٹی حقیقت سے فرار کے راستے پر گام زن ہو گئی تھی۔ ایسی صورتِ حال آمرانہ نظام کے مسلسل کام کرنے کے بعد پیدا کی گئی تھی۔ سالازار نے پرتگالیوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی ختم کر دی تھیں۔ اُس نے پرتگال کا پورے کا پورا نظامِ تعلیم تک تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اُس نے سوچنے سمجھنے کا پورا نظام ہی تباہ کر دیا تھا۔ اُس نے سوسائٹی کے فطری بہاؤ کو ہی ختم کر دیا تھا۔ ہر جگہ ڈنّا لگا دیا تھا۔ مثلاً یہ کہ آپ یہ کر سکتے ہیں، اور یہ نہیں کر سکتے۔ سارااما گو بہت بڑا رائٹر ہے۔ سارااما گو محض پرتگالی تناظر میں ہی بات نہیں کرتا، وہ انسانی تناظر میں بات کرتا ہے۔ وہ بڑے کینوس پر بات کرتا ہے۔ مثلاً حقیقت کا ادراک کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہونا، ایک بہت بڑی اذیّت ہے کہ آپ خود احتسابی نہ کر سکیں، خود شناسی نہ کر سکیں۔ اس سے بڑی اور کیا؟ حقیقت ناشناسی ہو سکتی ہے؟ یہ وہ صورتِ حال ہے جو عالمی تناظر رکھتی ہے اور اِس طرح کی صورتِ حال ورلڈ وائڈ ہے جو مغربی معاشرے ہیں یا مشرقی معاشرے، اُن میں بھی یہ ساری بدمعاملگیاں موجود ہیں اور یہ عناصر کیپیٹل ازم ہی کا نتیجہ ہیں۔ یہ جو استحصالی کلچر ہے کہ جہاں پر 'اوپریسڈ' بھی 'اوپریسر' بن جاتا ہے۔ کیا یہ کیپیٹلسٹ سوسائٹی (سرمایہ دارانہ سماج) کا شاخسانہ نہیں ہے؟ مثلاً انسان جو کچھ بھی کھاتا ہے، وہ کسی نہ کسی صورت انسانی جسم میں نظر آتا ہے۔ مثلاً انسان جس ماحول میں پڑھتا، پڑھاتا ہے، وہ بھی اس کی سوچ پر اور اُس کے نظریات پر اور اُس کے اعمال و افعال پر حاوی ہوتا ہے اور نظر بھی آتا ہے۔ 'اوپریسڈ' کیوں 'اوپریسر' بن جاتا ہے، وہ اِس لیے کہ پورے کا پورا سسٹم ہی بندے کو کُچل دیتا ہے کہ ایک انسان اچھے اور بُرے کی تمیز ہی نہیں کر پاتا، وہ اِس لیے کہ اُس سے تمیز کرنے کی صلاحیت ہی چھین لی جاتی ہے۔ ذاتی تسکین

(Personal Gratification) اور وہ بھی فوراً، مثلاً بچہ یہ کہتا ہے کہ مجھے فلاں چیز چاہیے اور وہ بھی فوری چاہیے۔ بچے کو نہیں معلوم کہ اُس کے لیے وہ چیز اچھی ہے، یا بُری؟ کیا ہے اور کیسی ہے؟ جیسے اپنے بچپن میں حضرت موسیٰ نے انگارے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا، انگارے کو اپنے منہ میں لے لیا تھا، کیوں کہ وہ چیز اُنھیں اچھی لگ رہی تھی۔ اُنھیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا چیز ہے، اُنھوں نے انگارا اپنے منہ میں ڈال لیا تھا۔ اِسی طریقے سے کہ انسان جس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے اور مختلف چیزوں کو جانچنے پرکھنے اور تمیز کرنے کی بھی صلاحیت ہونی چاہیے، اور جس وقت پوری سوسائٹی ہی حقیقت کو جاننے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے تو پھر انسان حقیقت سے ناشناس ہو کر انگارے کی طرف ہی پلٹتا ہے۔ یہ جو 'بلائنڈنیس' ہے۔ یہ بلائنڈنیس پرتگالی معاشرے تک ہی محدود نہیں ہے، یہ بلائنڈنیس پوری انسانیت کا حصار کیے ہوئے ہے۔ یہ بلائنڈنیس پورے کے پورے سماج کو نہ صرف جکڑے ہوئے ہے بلکہ تیرہ و تار کیے ہوئے ہے۔ اگر یہ بلائنڈنیس نہ ہو تو 'روانڈا' Rwandan Civil War والا واقعہ کیسے اور کیوں کر ہو سکتا تھا؟ وہاں جو ۱۹۹۰ء میں بڑے پیمانے پر سِول وار (خانہ جنگی) کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ روانڈا کی افواج نے وہاں کے صدر کی وفات کے فوری بعد اُس وقت کی موجودہ حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا اور وہاں پر بغاوت اور انتشار کا سلسلہ ۱۹۹۴ء تک برابر جاری رہا تھا۔ روانڈا کے دو قبائل کے درمیان بڑے پیمانے پر لڑائی ہوئی تھی، اگر حقیقت کا ادراک ہوتا تو خانہ جنگی کیوں کر ہو سکتی تھی؟ وہاں بڑے پیمانے پر نسل کُشی کروائی گئی۔ وہ کیا تھا؟ جس میں بھائی، بھائی کی جان کا دُشمن ہو گیا تھا۔ برصغیر میں ۱۹۴۷ء میں کیا ہوا تھا؟ روانڈا میں پورے ملک کو خانہ جنگی نے مضمحل کر دیا تھا۔ جس قبیلے کے لوگوں کو ۱۹۹۰ء میں مارا گیا تھا اور جس کی نسل کُشی کی گئی تھی، اب روانڈا میں اُس قبیلے کی حکومت ہے، اُن کو ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۴ء تک مغرب کی سپورٹ سے مارا گیا تھا۔ اب وہ دوسرے قبیلے یعنی 'ہُوتُو' نسل کے لوگوں کو بولنے تک نہیں دیتے۔ اُن کو ہلنے تک نہیں دیتے۔ یہ 'بلائنڈنیس' نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ Brutality ہی تو ہے اور اسی کو سارااما گو کُھرچتا ہے۔ انسان کے DNA سے سارااما گو اسی درندگی کو کُھرچتا ہے۔ وہ اسی کی بنیادی حقیقت کو دیکھتا ہے۔ اسی لیے وہ ایک بڑا رائٹر ہے۔ وہ اس بلائنڈنیس کے مضمرات کو ہی ڈیسائفر کرتا ہے۔ وہ اُنھی مضمرات سے انسان کو ڈراتا ہے کہ رُک جاؤ۔ یہ نہ کرو۔ وہ اِس لیے کہ اس بلائنڈنیس کے مضمرات اتنے ہوش رُبا ہیں کہ آپ اُس کو نسلِ انسانی کے طور پر برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اگر یہ چیز معاشرے میں سرایت کر جائے تو معاشرہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سارااما گو کے مذکورہ ناول نہایت عمدہ اور خوب صورت ہیں، جنھیں آپ پڑھنا شروع کر دیں تو مزاحمت نہیں کر سکتے۔ اُن کے ناول اپنے قاری پر کئی ایک حوالوں سے سحر طاری کر دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. انورسن رائے۔اس ناول کو نہ پڑھیں (آرٹیکل)۔(۱۶ مئی ۲۰۱۲ء)۔بی۔بی۔سی نیوز اُردُو (B.B.C Urdu.com, Karachi)

۲. خوزے ساراما گو۔اندھے لوگ (مترجم: احمد مشتاق)۔(۲۰۲۱ء)۔جہلم: بُک کارنر۔(ص:۱۶۸۔۱۶۷)

۳. سید جعفر احمد۔خوزے ساراما گو کا دلدوز مگر فکر انگیز ناول "اندھے لوگ"۔ مشمولہ؛ (قرطاس اَدب)۔(۲۲ جولائی ۲۰۲۰ء)۔(ای۔تحریر؛ روزنامہ جنگ۔۱۸ فروری ۲۰۰۱ء)

۴. خوزے ساراما گو۔اندھے لوگ (مترجم: احمد مشتاق)۔(۲۰۲۱ء)۔جہلم: بُک کارنر۔(ص:۳۵۲)

۵. Article by Alex Eichler, Published by: The Atlantic, June 19, (2010) (From the archive of their Partner "Wire")

۶. عبدالرحمٰن۔عالمی اَدب کے اُردُو تراجم۔(۱۶ جنوری۔۲۰۲۰ء)۔پوسٹ (web.facebook.com)

۷. انورسن رائے۔اس ناول کو نہ پڑھیں۔(آرٹیکل)۔(۱۶ مئی ۲۰۲۱ء)۔بی۔بی۔سی نیوز اُردُو

۸. ایضاً

۹. ایضاً

۱۰. خوزے ساراما گو۔اندھے لوگ۔(مترجم: احمد مشتاق)۔(۲۰۲۱ء)۔جہلم: بُک کارنر۔(ص:۳۴۹)

۱۱. محمد قاسم بگھیو، ڈاکٹر۔(دیباچہ)۔التوائے مرگ۔ خوزے ساراما گو۔(مترجم: مبشر احمد میر)۔(۲۰۱۷ء)۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان۔(ص:۶)

۱۲. خوزے ساراما گو۔اِلتوائے مرگ۔(مترجم: مبشر احمد میر)۔(۲۰۱۷ء)۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان۔(ص:۱۱)

۱۳. ایضاً۔(ص:۲۸)

۱۴. ایضاً۔(ص:۳۲)

۱۵. Article by Alex Eichler, Published by: The Atlantic, (June 19,2010) (From the archive of their Partner "Wire")

۱۶. رشید جالندھری ، ڈاکٹر۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے فکری مباحث۔ مشمولہ؛(قائد اعظم لائبریری کا اَدبی مجلہ مخزن)۔ شمارہ:۳۹۔(ص:۵۴)
۱۷. محمد احسن فاروقی،ڈاکٹر۔ناول کیا ہے ؟۔(۱۹۴۸ء)۔ لکھنو: دانش محل۔(ص:۱۹۶۔۱۹۵)
۱۸. آئی۔فر۔ایونس۔انگریزی ناول ونثری سرمایہ۔(مترجم: ڈاکٹر زکی کا کوروی)۔(۱۹۴۹ء)۔ لکھنو: مرکزِ ادب اُردو۔(ص:۱۵۱)